بیکار

اسی روپے تنخواہ، مہنگائی بھتہ، امتحانوں کی فیس ملا جلا کر گزر بسر ہو جاتی تھی۔ کچھ بچتا ہی نہ تھا، مگر قرض ایک مہینے کا دوسرے مہینے میں چلتا ہی چلا جاتا تھا۔ نسیم کی پیدائش میں بھی کھینچ تان کر پورا پڑ جاتا۔ اگر حاجرہ کا بخار جان کو نا لگ گیا ہوتا تو۔ جھمکیوں کو بیچنے کی نوبت نہ آتی۔ کس ارمان سے جھمکیاں بنوائی تھیں، بڑا دکھ ہوا۔ خیر "پھر بن جائیں گی۔"

مگر یہ سب دل کے بہلاوے کی باتیں ہیں۔ جہیز کی ساری چیزیں ایک بار ختم ہو کر پھر نہ بن سکیں۔ جگنو مہدی کے امتحان کی فیس کی نذر ہو گیا۔ سوچا تھا، چلو نوکری تو مستقل ہو جائے گی ہزار جگنو بن جائیں گے۔ ہر مہینے جگنو کا حساب لگتا۔ سونے کی قیمت گھٹنے کا نام ہی نہ لیتی۔ غضب خدا کا۔ اکیس روپے سے ایک سو سولہ پر آ گیا۔ بھلا کیا جگنو بنوائے کوئی۔

اللہ میاں نے ماں کی چھاتیوں میں دودھ بھی شاید باقر میاں جیسوں کی تنخواہ کا اندازہ لگا کے دیا ہے۔ مکان کا کرایہ نہ ہو نہ سہی۔ روکھی سوکھی چل ہی جائے گی۔ پر بچے کا وہی شاندار سامان قدرت نے اپنے ہاتھوں سے سجا دیا ہے۔ مگر بخار میں کم بخت دودھ بھی سوکھ گیا۔ اماں جی تو یہی کہتی رہیں۔ "بُوا فیشن ہے بوتل سے دودھ پلانے کا۔ ہمارے زمانے میں تین تین سال پلاؤ تب بھی نہیں ختم ہوتا تھا۔"

پر بھلا اُن سے یہ کون کہتا کہ "بُوا تمہارے زمانے میں ڈالڈا نہیں تھا۔ بھر بھر پیالے اچھوانی سٹورے اڑاتی تھیں۔ پھر تین سال دودھ پلاتی تھیں تو کون سی توپ چھوڑتی تھیں۔" مگر بُوا کے منہ لگنا اپنی میت اٹھوانا ہے۔ وہ پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑتیں کہ ہوش اڑ جاتے۔ کئی کئی دن بُوا کے طعنے چلا کرتے۔ چلو بات ختم ہوئی، کہہ لیا، سُن لیا، چھٹی ہوئی۔ مگر بُوا کو اور کام ہی کیا تھا۔ سوائے اپنی گھٹیا کوکو سنے کے۔ گھٹیا کے ساتھ کوئی اور ہاتھ آ جاتا، بس اُسی کی دوہراتیں۔

جب تخفیف میں باقر میاں کا نام آیا تو پہلے تو اسے مذاق سمجھتے رہے، نو برس نوکری کی، مستقل نہیں تھے تو کیا ہوا، ہو جائیں گے۔ اپنی سرکار ہے۔ اپنی فکر آپ کرے گی۔ خیر، نوٹس ملا ہے تو کیا ہوا۔ پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا۔ ذرا سی دوڑ دھوپ کے بعد پھر کسی دوسرے اسکول میں لگا دیئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ چھ مہینے کہیں جگہ خالی نہ تھی تو رجسٹرار کے دفتر ہی میں لگ گئے تھے۔ مطلب تو تنخواہ سے تھا۔ جب تک ملتی رہی خیال بھی نہ آیا کہ عارضی ہیں یا مستقل۔

پر اب کے تو ایسا پکا جواب ملا کہ ڈیڑھ سال کی دوڑ دھوپ کے بعد معلوم ہوا کہ کسی کے بس کی بات نہیں اور کوئی گنجائش بحالی کی نہیں رہ گئی ہے۔ نو سال مستقل نہ ہونا ہی نکمے پن کا ثبوت تھا۔ ویسے تو ان سے چار ہاتھ اگلے پڑے روٹیاں توڑ رہے تھے۔ مگر فرق اتنا تھا کہ انہوں نے مستقلی کی کھائی پھاند لی تھی، انہوں نے سستی یا لاپرواہی کی وجہ سے اس کی کچھ اہمیت ہی نہ سمجھی۔

یہ ڈیڑھ سال کیسے گزرا، یہ ہاجرہ بی جانیں یا باقر میاں یا کچھ اماں جی۔ مگر انہیں تو گیارہ روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔ اُن کے پان تمباکو اور افیون کو پورا پڑ جاتا تھا۔ کبھی کھانے کے سوا اُوپر سے پیسے کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ ہوئی۔ مرنے والے نے مر کے بھی اتنا سہارا تو چھوڑا۔

کیسی جھمکیاں اور کیسا گلو بند۔ ایک ایک کر کے تار تار پہلے گروی ہوا۔ پھر بک گیا۔ افسروں کے گھر کی خاک لے ڈالی پر نوکری واپس نہ ملی۔ سال میں چھ مہینے دو ایک ٹیوشن مل جاتے۔ مگر بھری کلاس پڑھانے کے عادی ٹٹر روں ٹوں ایک دو بچوں کو پڑھاتے بوکھلا اٹھتے۔

ہاجرہ بھی نے پنجاب سے میٹرک کر کے اپنے طبقے کی بیویوں میں کافی قابل اعتراض حد تک آزاد ہونے کا رُتبہ پالیا تھا۔ جب شادی ہوئی تو سارا پڑھا لکھا بال بچوں کی دیکھ بھال میں ناک کے راستے نکل گیا۔ برسوں سے کوئی کتاب ہاتھ سے بھی نہیں چھوئی تھی۔ کبھی جی گھبراتا تو دوپہر کو پرانی ''سہیلی'' کی جلدیں جو میکے سے مل تھیں پر پڑھ ڈالتیں۔

ہاجرہ بی کے ابا کو بیٹی کی تعلیم کا بڑا شوق تھا۔ زنانے پرچے مستقل اُس کے نام آتے رہے۔ شادی کے بعد کچھ لاپروائی، کچھ مشغولیت اور کچھ پیسے کی کمی کی وجہ سے رسالے وسالے سب بند ہو گئے۔

جب پڑوس نے ہاجرہ بی کو پاس کے اسکول میں عیوض کرانے کی رائے دی تو بی اماں نے اُن کی سات پشتوں کی قبر میں کیڑے ڈال دیئے۔ پڑھی لکھی عورتوں کے چال چلن کے بارے میں

اتنے ڈراؤنے قصے سنائے کہ ہاجرہ نے کان پکڑ لئے کہ ''توبہ میری میں کہاں کر رہی ہوں نوکری ؟'' یہ ساری موٹی استانیاں ماسٹروں سے ہلکی ہوویں ہیں۔ اسکولوں کا تو بہانہ ہے۔ گھر میں ٹکوا نہیں لگتا تو اسکول میں گل کھلانے جاویں ہیں۔'' وہ کہا کرتیں۔

مگر ضرورت انسان کو تھوک کر چاٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب گھر سے نکالے جانے کی نوبت آ گئی اور پاس پڑوس کے اُدھار دینے والوں نے سچ مچ دروازے مُنہ پر مار دیئے تو ہاجرہ کو پڑوسن کی بات پر غور کرنا ہی پڑا۔

''وہ اور کوئی اُلو کے پٹھے ہوں گے جو بیوی کی کمائی کھاتے ہوں گے۔'' پوچھنے پر باقر میاں نے کہا۔ ''ابھی اتنا دم ہے۔ جب مر جاؤں تو جو جی میں آئے کر لینا۔''

''اب تو زیور بھی نہیں رہا۔ سب تار تار کر کے بک گیا۔''

''بک گیا تو کیا ہے۔ کہا تو کہ پیسہ آیا تو تمہارا سارا زیور بنوا دوں گا۔ مری کیوں جاتی ہو۔''

''اونہہ، آ چکا اب تو پیسہ، سال میں تین چار سو میں کیسے گزر ہو سکتی ہے۔''

''دیکھو جی اگر یہ آوارگی کرنا ہے تو طلاق لے لو اور مزے کرو۔ میں دنیا کی لعنتیں نہیں سنوں گا۔'' باقر میاں نے غرا کر کہا۔ اور پھر ہاجرہ جی کو ہمت نہ ہوئی۔

ایک تو روپے کی کمی، اوپر سے سب ہی کا مزاج چڑ چڑا۔ اماں جی کی تو سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔

''اے بی، ہماری تو اپنے گیارہ روپے میں گزر ہو جاوے ہے۔ ہم پوچھیں ہیں، دُلہن سے کیوں نہیں گھر چلتا۔'' وہ بڑبڑائیں۔ حساب سُننے اور سمجھنے کی نہ اُن میں طاقت تھی اور نہ دماغ۔ کوڑی کوڑی کا حساب موجود ہے۔ مگر یہی رٹ لگی ہے۔

''ارے بُوا، اتنے روپے میں تو کنبے پل جاویں ہیں۔ تمہارے میں برکت ہی نہیں دلہن، آخر ہم کیسے گزر کریں ہیں۔

''آپ کو نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے۔ نہ کھانے کا۔ نہ بھنگی بہشتی کا۔ رہ گئی افیون کی لت تو.....''

لت کا نام سن کر مختصر والی اماں جی کا پٹھانی خون جوش میں آ گیا۔

''ہمارا رہنا بھی کھٹکے ہے۔ ہاں کرایہ لو اس چوبے کے بل کا۔ دو روٹیاں کھاتی ہوں۔ حساب

لگا کے لے لو اپنے پیسے۔ کیا سمجھا ہے؟ ابھی دم ہے اتنا۔ کسی کے برتن بھانڈے کر کے اتنا مل جائے گا۔ ہاتھ پیر نہ رہیں گے تو سڑک پر پھنکوا دیجیو۔ اللہ کے نام کے ٹکڑوں پر رنڈا پاکٹ ہی جائے گا۔ لو اور سنو، ہم اپنے بیٹے کے گھر رہوئیں ہیں۔ کسو مال زادی کے یہاں نہیں روٹیاں توڑنے جاویں ہیں۔

لاکھ ہاجرہ بی نے سمجھانے کوشش کی کہ ''میں نے تو حساب بتایا تھا۔ میرا خدا نہ کرے یہ مطلب تھوڑی تھا کہ آپ ہمارے اوپر بوجھ ہیں۔'' مگر وہ کہاں سُننے والی تھیں۔ جو چلی ہے اُن کی راگنی تو پھر رُکنے کا نام نہیں۔ خود اپنی، اپنے خاندان کی سات پُشتوں کو یاد کر کر کے ماتم کرتی رہیں۔ باقر میاں رات کو تھکے ہارے ٹکا سا جواب پا کر جوں ہی گھر میں گھسے، اماں جی کا ریکارڈ پھر سے شروع ہو گیا۔ آدھی رات تک چلتی رہی چکی۔ ہاجرہ نے بھی جل کر میاں کو ''نکھٹو'' کہہ دیا۔ اور باقر میاں نے حساب کتاب لگا کر ہاجرہ بی کو ''پھوہڑ'' ثابت کر دیا۔ اور اماں جی ان دونوں کو جو کچھ باقی رہا تھا کہہ سُنایا۔ مگر کسی کے کلیجے میں ٹھنڈک نہ پڑ سکی۔

ہاجرہ بھی رات بھر روتی رہیں۔

اماں جی کراہتی رہیں۔

اور باقر میاں ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔

بیچ بیچ میں نسیم ڈراؤنے خواب دیکھ کر روتا رہا۔ اور مہینوں کی جو تم پیزار کے بعد یہ طے ہوا کہ اگر ہاجرہ بی عارضی طور پر کام کرنے لگیں تو اتنا زیادہ ہرج تو نہیں، جیسے ہی باقر میاں کو نوکری ملے گی، چھوڑ دیں گی۔

''ہاں جی بس اب میں نے بورڈ کی میٹنگ میں عرضی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں خود جاؤں گی اسکول کمیٹی کے دفتر، دیکھتی ہوں کیا جواب دیتے ہیں۔''

''کوئی مجھے شوق ہے منحوس نوکری کا، تمہیں نوکری مل جائے تو میں کروں ہی کیوں ؟''

ہاجرہ بی نے اطمینان دلایا۔

''اے بھئی میں کون ہوں رائے دینے والی، قسمت میں جو لکھا ہے سو تو ہوئے گا ہی'' اماں جی نے بھی رضامندی ظاہر کی۔

اور ہاجرہ نے مبلغ باون روپے پر اسکول میں بچوں کی پہلی جماعت کو پڑھانا شروع

کیا۔ تجزیے سے معلوم ہوا کہ اس طریقہ تعلیم میں علم سے زیادہ دھموکوں اور طمانچوں کی مانگ ہے۔ صبح سے لے کے شام کے پانچ بجے تک گلا پھاڑ کر بچوں کو ڈانٹنا۔ ان کی مار پٹائی میں اپنی پٹائی کی ڈھاک بٹھا کر امن قائم کرنا، بڑی اُستانی جی کو رام کرنے کے لئے سارے وقت اُن کے خاندان بھر کے لئے ساڑھیاں، بلاؤز کاڑھنا، سوئیٹر بنانا اور لحاف توشک میں ڈورے ڈالنا۔ ہاجرہ بی کی کڑائی کی وہ دھاک بندھی کہ ہر مہربان نے اتنی ساڑھیاں کڑھوائیں کہ آنکھوں کے آگے تارے ناچ اٹھے۔

ہاجرہ بی کو اپنے سلیقہ پر ناز تھا۔ آج وہ سلیقہ گلے میں پھندا بن کر پڑ گیا۔ انکار کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ویسے روپے نہیں، اوپر کی کچھ آمدنی ہو ہی جاتی تھی اور کچھ نہیں تو دوپہر کے کھانے کا ہی ٹھکانہ ہو جاتا تھا۔ کبھی کوئی ساڑھی کے شکریہ میں مٹھائی یا بسکٹ ہی بچوں کے لئے دے دیتیں۔

سب ہی کو ہاجرہ بی کے گھر کا حال معلوم تھا۔ اور کچھ نہ کچھ دیتے دلاتے ہی رہتے تھے۔ مگر ایک دن جب بڑی اُستانی جی نے کچھ پرانے کپڑے بچوں کے لئے دئے تو ہاجرہ بی کو تاؤ آ گیا۔ جی چاہا کہہ دیں ''اُستانی ہوں بھکارن نہیں ہوں''۔ پر کچھ سوچ کے غصہ پی گئیں۔ کیا فائدہ بگاڑ کرنے سے۔ ذرا دو روٹی کا سہارا ہوا ہے۔ کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ مگر گھر آ کر کپڑے مہترانی کو دے دئے۔ اماں بھی نے فوراً نوٹ کر لیا۔ باقر میاں سے آتے ہی جڑا۔

اچھے بھلے کپڑے مہترانی کو دئے جا رہے ہیں۔ ان کے باپ کے گھر یوں ہی لنگر بٹے تھا۔ جبھی تو کہوں بیٹا، تیری کمائی میں برکت کیوں نہیں۔

جب سے بیوی کو نوکری ملی تھی۔ باقر میاں کا عجیب حال تھا۔ نہ اگلے بنتی تھی نہ نگلے، بس چلتا تو بیوی کو ایک پل نوکری نہ کرنے دیتے۔ یار دوست مذاق ہی مذاق میں چٹکیاں بھرتے۔

''یار عیش ہیں تمہارے تو مزے سے جورو کما کے لاتی ہے۔ بیٹھ کے کھاتے ہو۔ یہاں بیگم کا ہماری وہ نخرہ ہے کہ معاذ اللہ ! ہل کے پانی نہیں پیتیں، آئے دن زیور اور کپڑے کی فرمائش۔

''یار سچی بات تو یہ ہے کہ آپن کو بھی یہ آزاد قسم کی بیوی نہیں پسند، اماں عورتوں کا مصرف تو یہی ہے کہ مرد کا جی خوش کرے۔ زیور کپڑے کی فرمائش کرنا تو اس کا حق ہے۔ سالا وہ بھی کیا مرد جو عورت کو زیور کپڑے کو ترسائے۔'' دوسرے صاحب فرماتے۔

بھئی تمہارا ہی جگرا ہے جو بیوی کو تیرے میرے پاس بھیج دیتے ہو یار، قسم خدا کی میں تو خودکشی

کرلوں پر یوں جورو کے ٹکڑوں پر مجھ سے نہ اینڈا جائے۔

''ارے یہ بورڈ کے ممبر ! سالے پرلے درجہ کے حرام زادے ہیں، یہ اسکول کا نام ہے۔ دراصل چکلے ہیں چکلے، بُرا نہ ماننا خیر تمہاری بیوی تو شریف ہے۔ یہ سالیاں اُستانیاں اول نمبر کی وہ ہوتی ہیں۔ یہ سب ممبروں کے گھر جاتی ہیں۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ ارے یار ان اُستانیوں کو دیکھ کر تے آتی ہے۔ سالیاں سب کافی کھتری، اُجاڑ صورت۔ یہ ممبر سُسرے بھی گھامڑ ہوتے ہیں پورے۔ عشق بھی لڑاتے ہیں ہیں تو تھرڈ کلاس مال سے۔ یار ہمارے محلے میں ایک سالی اُستانی تھی۔ پیٹ بھر کے بدصورت بکری کی سی کالی ٹانگیں برقعے میں سے نکلی ہوئی۔ جب میرے گھر کے سامنے سے گزرتی میں لونڈوں سے کہتا، لٹادو سالی پہ کُتا۔ یار بڑا مزا آتا تھا۔ لنگڑے کوئے کی طرح پُھدکتی بھاگتی تھی۔ بڑی پارسا بنتی تھی۔ سالی کو پیٹ رہ گیا۔ نکالی گئی محلے سے جوتے مار کے۔''

ترکش کے تیر باقر میاں کے سینے میں اترتے رہتے اور وہ کھسیانے ہنس کر بات ٹالتے رہتے۔ سُنی ان سُنی کر جاتے۔ جب برداشت کی طاقت شل ہو جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ کر چلے آتے، آتے ہی اماں جی دو چار ٹکاتیں۔

''آج نسیم کو ناشتہ بھی نہیں دیا اور بیگم صاحبہ چلتیں بنیں۔ میں کہوں یہ اِتے سویرے سے اسکول مٹ گئے میں کیا ہووے ہے۔ میاں میں بڑھیا ٹھڑیا قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہوں۔ آج مری کل دوسرا دن مگر مجھے تو تمہارے اوپر ترس آوے ہے۔ کیسے گذر ہوگی۔ ان بچوں پر کیا اثر پڑے گا کہ اماں کا پیر گھڑی بھر کو بھی گھر میں نہیں ٹکے ہے۔''

باقر میاں کا خون کھولتا۔

''آج آجائے حرامزادی، مزہ نہ چکھادیا تو باپ کا نطفہ نہیں۔''

اسکول کے بعد بڑی استانی جی رجسٹروں کی جانچ پڑتال شروع کر دیتیں یا لائبریری کی کتابوں کا فائل لے بیٹھتیں۔ یا امتحان کے پرچے نقل کروانے لگتیں۔ ہاجرہ بی کام کرتی جاتیں۔ اور سوچتی جاتیں۔

''سلو بھوکا رہ گیا۔ اللہ اماں جی نے جنے ناشتہ کرایا کہ نہیں۔ کہیں رات کی دال نہ دے دی ہو۔ کچھ کھٹی سی لگی تھی۔ کہنا بھول گئی۔ پھینک دیتی تو اچھا ہوتا۔ کل دھوبی کپڑے لایا تو ملانے کی

مہلت ہی نہ ملی۔ نہ جانے کیا کیا کھو کے لایا ہوگا۔ شام کو ترکاری سستی ملی ہے۔ آج سلو کے لئے مٹر کی پھلیاں لے لوں گی۔ دودھ پانی ہوتا ہے کمبخت۔ کتنا دُبلا ہوتا جا رہا ہے میرا لال۔ جانے انہیں قمیض ملی ہوگی کہ نہیں۔ ساری قمیضیں پھٹ گئی ہیں۔ اب کے تنخواہ ملے تو دو قمیضوں کا کپڑا لے لوں۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ فکر کے مارے گھلے جاتے ہیں۔'' اور اُسے اُس وقت کے باقر میاں یاد آ گئے جب وہ نئی نئی بیاہ کر آئی تھی۔ کپڑوں کا کتنا شوق تھا ! بھری ہوئی تھی الماری سوٹوں سے۔ انسان پر بُڑھاپا آتے سُنا ہے۔ یہاں گھر بار ہی بوڑھا ہو گیا۔ باقر میاں تو ابھی جوان ہیں مشکل سے تین سال کے ہوں گے۔ ''ہاجرہ بی، یہ لسٹ تو ایک سرے سے غلط ہے۔'' بڑی اُستانی نے چونکا دیا۔

''جی.....'' ؟

''یہ دیکھو..... یہ تو تیسری کلاس کے نمبر ہیں۔ یہ کہاں تم نے پہلی میں ٹھونس دئے تمہارا دل بالکل نہیں لگتا چند دن میں دیکھ رہی ہوں تمہاری کلاس میں بھی غل مچتا رہتا ہے۔''

''میں ابھی دوسری لسٹ بنائے دیتی ہوں۔'' ہاجرہ بی نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا اور کاغذوں پر جُھک گئیں۔

بیکاری بھی انسان کو اتنا ہی بدمزاج اور نکما بنا دیتی ہے جتنا ضرورت سے زیادہ بیگار۔ سارے دن کے جڑے ہوئے اور احساسِ کمتری کے کچلے ہوئے باقر میاں نے تھکی ہاری ہاجرہ بی کو دیکھا تو ایک ایک کر کے سارے زخموں کے منہ کھل گئے۔

''کہاں سے تشریف آ رہی ہے اِتنی دیر میں ؟''

''جہنم سے۔'' ہاجرہ بی نے چڑ کر کہا۔

''اے بھیا، تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے..... کماؤ بیوی ہیں، کوئی مذاق ہے۔ پیٹ کو ٹکڑا دیتی ہے۔ جب جی چاہے گا آویں گی۔ جب چاہے گا جاویں گی۔'' دن بھر مکھیاں مارنے کے بعد اماں جی کو ذرا منہ کو ہوا بھی تو دینا تھی۔ لہٰذا آگ پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔

''میں پوچھتا ہوں، کہاں لگائی اتنی دیر ؟'' باقر میاں بہت ضبط کر کے بولے۔

''سلیم..... اے سلو..... بیٹے ! '' ہاجرہ بی نے چاہا کچھ نہ سنے۔ کچھ نہ دیکھے۔ نہیں تو اُس کے دماغ میں سے ایک لپکتا ہوا شعلہ نکلے گا جو کائنات کو بھسم کر ڈالے گا۔

''ہم بات پوچھ رہے ہیں اور تو اڑن گھائیاں بتا رہی ہے۔ حرامزادی..... اُلّو کی پٹھی۔'' باقر میاں نے خوف ناک انداز میں اُٹھتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا۔

ہاجرہ بی نے باقر میاں کی نیم پاگل آنکھوں میں دیکھا اور سہم گئی۔ مگر خوف نے زبان پر اور بھی زہر گھول دیا۔

''کمائی کرنے گئی تھی اور کہاں جاتی۔''

''کمائی کی بچی..... یہ اتنی شام تک کمائی ہو رہی تھی۔

''کہو، تو کل سے نہیں جاؤں گی۔'' ہاجرہ بی نے چڑانے کو مسکرا کر کہا۔ ''ایسا ہی بڑا عزت کا خیال ہے تو خود کیوں نہیں کماتے، یہ خوب ہے۔ سارا دن یہاں کمبخت بھجا مار کے آؤ اور اوپر سے گالیاں سنو۔ پڑے پڑے اینڈتے ہو۔ عورت ہو کے میں کماؤں، مزے سے تھور لیتے ہو، اوپر سے غراتے ہو۔'' ہاجرہ بی جانتی تھی وہ سب جھوٹ کہہ رہی ہے۔ باقر میاں نے کتنے دن ہو گئے تھے چٹخارا لیکر کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ لاکھ پوچھتی ''ٹھیک ہے نمک ؟'' ''ایں'' ؟ وہ چونک کر کہتے۔ ''ہاں ہاں سب ٹھیک ہے۔'' اور پھر اپنے خیالوں کے جال میں اُلجھ کر ڈوب جاتے۔ مگر اس وقت اُس کا جی چاہ رہا تھا۔ کوئی باقر میاں کا قیمہ کر کے کتوں کو کھلا دے۔

گالم گلوچ، جوتم پیزار، حسب پروگرام روزانہ کی طرح بینگ بڑھتے رہے اور بیچ بیچ میں اماں بی کے تیل کے چھینٹے۔ اور کچھ تو نہیں، بس یہی۔

''کہو بھلا میاں ہے کہ پاؤں کی پیزار ساری ہم نے تو اپنے غصے کے آگے کدی منہ نہ کھولا۔ ہاں بھئی، نکھٹو میاں اور کھجیلا کتا کسی کو نہیں بھاتا۔''

پھر پیٹ کی پکار دم بھر کیلئے زخموں پر کھرنڈ بنا دیتی۔ سر جھکا، خاموش منہ چلتے رہے۔ دل سلگتے رہے۔ باقر میاں کھری چارپائی پر پڑے بیڑی پھونکا کرتے۔

''اُٹھئے، بستر کر دوں''۔ وہ نرمی سے کہتی۔

''رہنے دو۔'' رُکھائی سے جواب ملتا۔

''اب ان نخروں سے کیا فائدہ۔'' وہ کوئی نرم بات کہنا چاہتی۔ مگر نرم باتیں تو جیسے خواب ہو گئی تھیں۔

''کہہ دیا ایک دفعہ۔ رہنے دو۔'' باقر میاں غُراتے اور ہاجرہ بی اپنی پلنگڑی پر پڑ کر گئی بیتی

زندگی کے سہانے خوابوں میں کھو جاتی۔ جیسے وہ خواب کسی غیر کے ہوں۔

کتنے دن ہو گئے تھے وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار سے نہیں بولے تھے۔ نوکری کے بعد باقر میاں اُس سے دور تر ہوتے چلے گئے۔ ہوں ہاں کے سوا۔ بات ہی بند کر دی۔ وہ سمجھتی تھی اُس کی اس قربانی کو سراہا جائے گا۔ ساس کے کچوکے کم ہو جائیں گے۔ میاں کا پیار تو ملے گا۔ میاں کما کر لاتا ہے تو بیوی اُس کے عیوض میں اپنا پیار دیتی ہے۔ اگر بیوی کما کر لائے تو کیا میاں کا یہ فرض نہیں کہ وہ کم از کم اُسے اپنے پیار سے تو محروم نہ کرے۔ آخر اُس کا قصور کیا ہے ؟ یہی نا کہ وہ سب کو فاقوں سے بچا رہی ہے۔ بجائے شاباشی دینے کے محلے کی عورتیں، اسے حقارت سے دیکھتی تھیں۔ جیسے وہ بازاری عورت ہو اور وہ پاک دامن گرہستنیں۔ کیا وہ بھوکا مر جانے دیتی تو پارسائی بڑھ جاتی۔ محلے کے مردوں کو اس کا احسان مند ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اُن کی جنس کے ایک فرد کا کام انجام دے رہی ہے۔ ایک کمانے والا مرد فرعون، اور کمانے والی بیوی مجرم ! خیر اُسے دنیا سے نہیں، باقر میاں سے شکایت تھی کتنے دن ہو گئے تھے اُنہوں نے اُسے پیار سے کلیجے سے نہیں لگایا تھا۔ اُن کے محبت بھرے لمس کے لئے اُس کا تھکا ماندہ جسم ترس گیا تھا۔ آج کل وہ بیکار سارا سارا دن خاموش پڑے رہتے۔ ایک دن وہ تھا جب نوکری سے عاجز تھے کہ پیار کے لئے وقت نہیں ملتا، خود اُس کا جی چاہتا تھا، ہر دن اتوار ہی رہے اور اب جب کہ زندگی ایک مسلسل اتوار بن گئی تھی۔ اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ کیا وہ دن کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے ؟ کیا وہ میاں بیوی کی زندگی ہی میں بیوہ ہو گئی۔

خُدا نے جیسے سُن لی ایک سایہ سا اپنے اوپر جھکا ہوا محسوس ہوا۔ باقر میاں اُسے سوتا سمجھ کر مُڑ کر جانے لگے۔ تڑپ کر ہاجرہ نے اُن کی آستین پکڑ لی۔ سلیم کی طرح باقر میاں سسکیاں لیتے اُس کے بازوؤں میں آ گئے۔ ساری غربت، ساری کثافت دو پیار کرنے والوں کے آنسوؤں نے دھو ڈالی۔ کتنے دُبلے ہو گئے تھے باقر میاں ! اُس کا گلا بھر آیا۔ اُن کے گالوں میں اتنی نوکیلی ہڈیاں تو کبھی نہ تھیں۔ جیسے صدیوں کے بعد وہ اُن سے ملی ہو۔ کتنا حسین تھا یہ جسم شادی کی رات !

وہ اُس کے بازو میں غافل سو رہے تھے۔ جیسے برسوں کے جاگے ہوں۔ اب وہ اسی طرح سویا کریں گے۔ کل سے وہ اپنی کھال اتار کر اُن کے قدموں کے نیچے بچھا دے گی، نہ جانے کتنے مہینے سے سر میں تیل بھی تو نہیں ڈالا۔ یہ اُن کے بھرے بھرے ہاتھوں کو کیا ہو گیا۔ جیسے بانس کی

بھچیاں ! چپکے چپکے وہ اُن کی ایک ایک اُنگلی کو چومتی رہی۔ آہستہ آہستہ کہ کہیں وہ جاگ نہ جائیں۔ اُس کا بازو سُن ہو گیا۔ مگر وہ ہلی نہیں۔ بہت دن بعد سوئے تھے باقر میاں !

اُس نے خواب میں دیکھا۔ باقر میاں کو نوکری مل گئی ہے۔ وہ اسکول جا رہے ہیں۔ اُس نے خواب میں گلوری دی تو اُنہوں نے اُس کی انگلی میں آہستہ سے دانت گڑو دیے۔ ساری کائنات گدگدی سے مچل پڑی اور ہاجرہ کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھا رہا تھا۔

''اُٹھ نصیبوں جلی، تیرا ارمان پورا ہو گیا۔'' اماں بی سر پیٹ کر کہہ رہی تھیں۔

''ہائے ڈائن، میرے لال کو کھا گئی۔''

☆.....☆.....☆